سیدہ نرجس افتخار
استادشعبہ اردو، گورنمنٹ کالج میرپور، آزاد کشمیر

علاّمہ اقبالؔ کا تصورِ تقدیر

Syeda Narjis Iftikhar

Department of Urdu, Govt College, Mirpur, Azad Kashmir

Iqbal's Idea of Destiny

Allama Muhammad Iqbal is a poet of much bigger thoughts, Ideas and unique presentations. He more clearly appeared as a top thinker of Muslim's philosophy in his famous addresses "The Reconstruction of Religious Thought in Islam". Here his Idea of Destiny in reference with his poetry and addresses, is discussed.

''تقدیر'' نہ صرف علمائے اسلام بلکہ ہر دور کے مفکرین وفلسفیوں کا موضوع فکر رہا ہے۔ تاہم علاّمہ اقبالؔ کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ اپنے دیگر تمام نظریات کی طرح تصورِ تقدیر کے حوالے سے بھی ان کے تمام افکار کی بنیاد قرآن پاک ہی ہے۔ انہوں نے نہ صرف شاعری میں بلکہ اپنے خطوط میں بھی اور اپنے مشہور خطبات مدراس میں خاص طور پر تصوّرِ تقدیر کے اہم مباحث پر گفتگو کی ہے اور قرآنی فکر کے مطابق نتیجہ دیا ہے۔

سب سے پہلے تو اس بات سے آگہی ضروری ہے کہ کسی بھی ہئیت انسانیہ، جماعت، گروہ، قوم اور فرد کی عملی وفکری زندگی میں تصورِ تقدیر بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کسی فرد، جماعت کا تصوّر تقدیر ہی ہے جو اس کی عملی زندگی کی بنیاد بنتا ہے۔ جیسا بھی کسی فرد یا قوم کا تصوّر تقدیر ہوگا اس کے عمل کی دنیا ویسی ہی نظر آئے گی۔ علاّمہ اقبالؔ کے افکار کی تشکیل اس وقت اور ماحول میں ہوئی جب ملت اسلامیہ اپنی سیاسی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی شان وشوکت، تفوق اور برتری کا سنہرا دور گزارنے کے بعد زوال، غلامی اور ذلّت کا شکار تھی۔ یہ بات مسلسل ذہن میں رہے کہ زوال کے اس دور میں ملتِ اسلامیہ صرف سیاسی زوال کا شکار ہی نہ تھی بلکہ ذہنی، فکری، روحانی، علمی اور اخلاقی سطح پر بھی اس کے زوال کا عمل جاری تھا (اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ بظاہر سیاسی سطح پر آزادی حاصل کرنے کے باوجود مذکورہ بالا سطح پر اس کا یہ زوال جاری نہیں ہے) اس ہمہ پہلو تنزل سے نکلنے، سناٹے اور جمود کی فضا سے ابھرنے کے لیے ظاہری عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی اور باطنی عوامل کی طرف توجہ دینا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ کیونکہ یہ کسی فرد، قوم کے باطنی محکم عقائد اور نظریات ہوتے ہیں جو اس کے عمل کی اصل بنیاد بنتے ہیں۔

اقبالؔ ملت اسلامیہ کو متحرک، فعال، مسلسل آگے بڑھتا ہوا دیکھنے کے آرزومند ہیں اور اس آرزو کی تکمیل کے لیے جہاں انہوں نے اپنی شاعری اور فکر کے ذریعے اصلاحِ عمل کے راستے متعین کیے وہیں اصلاحِ افکار کی بھی کوشش کی۔ ''تصورِ تقدیر'' اسی کوشش اصلاحِ افکار وعقائد ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ علامہ اقبالؔ سے پہلے ملت اسلامیہ خصوصاً برصغیر پاک و

ہند کے ادبیات وافکار میں تقدیر کی جبریئت کا تصور غالب تھا اور جو فکر عام اور مشہور تھی اس کا مکمل نمونہ یوں ہے کہ:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہ محض ایک شعر نہیں بلکہ اس ایک شعر کے آئینے میں اس عام طرزِ فکر اور ذہنیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں یہ اور اس جیسے بے شمار اقوال وافکار عوام وخواص میں عملاً رائج تھے کہ اپنی ہر تکلیف، مشکل، مصیبت غربت ذلّت کے اسباب پر غور کر کے ان کو دور کرنے کی بجائے تقدیر سمجھ کر راضی برضا رہا جائے' انفرادی اور اجتماعی سطح پر رضائے ربّ اور توکل علی اللہ کی گمراہ کن تاویلات بھی اسی کا حصہ تھیں۔ توکل، صبر، رضائے الٰہی، مشیتِ پروردگار محض بے عملی اور تساہل اور غیر ذمہ داری کی بنیادیں بن کر رہ گئیں یہاں تک کہ گناہ اور سرکشی کو بھی مشیت الٰہی سمجھا جا رہا تھا۔ اقبالؔ اس ابلیسی تصورِ تقدیر کی طرف ضربِ کلیم کی ایک نظم ''تقدیر'' میں اشارہ کرتے ہیں کہ ابلیس بارگاہ خداوندی میں اپنی نافرمانی کے جواز میں کہتا ہے:

حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

اور اسکے جواب میں بارگاہِ خداوندی سے آواز آتی ہے:

پستی ء فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلہء سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

نظامِ فطرت میں جو اٹل اور محکم مظاہر ہیں اقبالؔ ان کی جبریت کے منکر نہیں جیسے سلسلہ روز وشب یا سلسلہ موت و حیات، اقبال یہاں فطرت کے جبر کو اسی طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح کوئی بھی دوسرا انسان۔ ان کی مشہور نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگیٔ تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

مزید اس نظم کے بہت سے اشعار میں حیات وموت کی جبریت کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں اپنے مجبورِ محض ہونے کا حتمی اعلان کرتے ہیں:

نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

مگر مجبوری کے اس اعلان پر بیان ختم نہیں ہوتا بلکہ آگے فرماتے ہیں:

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظام کائنات
آہ! غافل! موت کا راز نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

آخرت کو زندگی کی ''جولاں گاہ'' کہہ کر اقبالؔ زندگی میں پنہاں ارادے اور اختیار کو ایک نیا میدان عمل مہیا کرتے ہیں۔ ایک بہتر، برتر، وسیع تر اور محکم تر اندازِ حیات!......وہ سورۂ ملک کی پہلی آیات: تبارک الذِی بیدِ ہِ الملک وھُوعلیٰ کلِّ شئیٍ قدیرo الذی خلق الموت والحیات لِیبْلُوَکُم اَیُّکُم اَحْسن عملاً۔ وھوالعزیز الغفورo سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گویا زندگی وہ فرصت ہے جس میں خودی کو عمل کے لاانتہا مواقع میسرّ آتے ہیں اور جس میں موت اس کا پہلا امتحان ہے تا کہ وہ دیکھ سکے کہ اس کو اپنے اعمال کی شیرازہ بندی میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ (۱)

انسانی زندگی میں موت ایک ایسا مظہر ہے جہاں واقعی یہی لگتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے مگر اقبالؔ کے نزدیک یہ مجبوری ایک وسیع تر اختیار حاصل کرنے کا زینہ ہے کہ موت کے مرحلے سے گزرے بغیر انسان (خودی) کو مادی علائق کے جبر سے آزادی حاصل نہیں ہوسکتی اور اس مادی اور بدنی جبر سے آزادی کے بعد ہی: ''خودی اپنے گزشتہ اعمال کا جائزہ لیتی اور مستقبل میں اپنے ممکنات کا اندازہ کرتی ہے۔''(۲)

تفصیلات سے قطع نظر حیات دنیاوی، حیات برزخی اور حیات اخروی ایک ہی تسلسل کا نام ہے اور یہ تسلسل، مسلسل جدوجہد، مسلسل خوب سے خوب تر کی طرف سفر اور مسلسل اپنی محدود خودی کو لامحدود خودی سے قریب تر کرنے کا عمل ہے۔ حیات کے ان تین مقامات میں جبر، ٹھہراؤ سکوت یا جمود کی کہیں کوئی گنجائش ہی نہیں۔ الا یہ کہ خودی ہلاک ہو جائے...... ہلاکت سانس کی آمدوشد کا قطع ہو جانا نہیں بلکہ ہلاکت 'خودی' کا ایک مرحلے پر پتھر کی طرح سخت ہو جانا ہے۔ جس میں مزید بہتری یا ارتقاء کی گنجائش نہیں۔ اور جہنم یا ھاویہ اس لئے نہیں کہ ''منتقم جبّار'' حکمران، گناہگاروں کو ہمیشہ اس میں گرفتار رکھے بلکہ اقبالؔ کے الفاظ میں:

وہ درحقیقت تادیب کا ایک عمل ہے تا کہ خودی جو پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے وہ پھر رحمتِ خداوندی کی نسیمِ جانفزا کا اثر قبول کر سکے لہٰذا جنت بھی لطف وعیش یا آرام وتعطّل کی کوئی حالت نہیں، زندگی ایک ہے اور مسلسل اور اس لئے انسان بھی اس ذات لامتناہی کی نو بہ نو تجلّیات کے لیے، جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے ہمیشہ آگے ہی بڑھتا ہے۔ (۳)

یہاں غیر اسلامی راہبانہ تصوف کی ایک مقبول اور معروف اصطلاح ''فنا فی اللہ'' کا ذکر ضمناً بے محل نہیں ہوگا جس میں ''عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا'' انسانی زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ قطرے کا دریا میں فنا ہو جانا، قطرے کی معراج نہیں ہے بلکہ قطرے کا دریا کی صفات اپنے اندر پیدا کر لینا اس کی حقیقی معراج ہے اور ارشادِ قدرت ہے: صبغۃ اللہ o وَمَنْ اَحْسَنُ مِن اللّٰہِ صِبْغَۃً وَّنَحْنُ لہ عٰبِدُ ونo ترجمہ: رنگ جو اللہ ہی کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں: (۴)

اور عبدیت کی معراج کی کیفیت یہ ہے کہ قطرہ سمندر سے ہمکنار ہونے پر بھی اپنی ہستی قائم رکھے جیسا کہ علامہ اقبالؔ نے معراج ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے لکھا: ''اس (خودی، عبدیت) کے نشو ونما کا معراج کمال یہ ہے کہ ہم اس خودی سے براہ راست اتصال میں بھی جو سب پر محیط ہے، اپنے آپ کو قائم و برقرار رکھ سکیں۔''(۶) جیسا کہ قرآن مجید میں حضورﷺ کے مشاہدۂ ذات کے بارے میں ارشاد فرمایا: مازاغ البصر وَمَا طَغٰیo (۶)

ہر قسم کا تصورّ فنا، ہلاکت یا فنا فی اللہ بھی دراصل جبریت ہی کا شاخسانہ ہے۔ تقدیر کا یہ جبری تصور بلکہ اقبال کے الفاظ میں ''نہایت درجہ ذلت خیز تقدیر پرستی'' صدیوں تک عالم اسلام کے اذہان پر چھائی رہی جس نے قوت عمل کو مفلوج اور قوتِ فکر، صناعی، خلاقی، تسخیر فطرت، تسخیر کائنات اور سائنسی ترقی کو معدوم کر دیا۔ اس کے رائج ہونے کے مختلف اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اس کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؔ نے اس کے دو بڑے اسباب بیان کئے ہیں۔ ایک مغربی فلسفیانہ افکار دوسرے سیاسی مصلحت پسندی۔ ہر دو نے زندگی کی وہ قوت جو تمام مسلمانوں کے اندر پیدا کی تھی، ختم کر دی اور انہیں بے حس و حرکت بنا کر گمراہ کن سکوت اور احساس بیچارگی (جس کو صبر بھی کہا گیا) پیدا کر دی۔ کہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں:

> دوسری جانب دمشق کے موقع شناس اموی فرمانرواؤں کو بھی جو عملاً مادہ پرستی اختیار کر چکے تھے، کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر، پردہ ڈال دیں تا کہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور انہیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کر دیں...... چنانچہ کہا جاتا ہے جب معید نے حسن بصری سے کہا اموی مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی یونہی تھی تو حسن بصری نے کہا ''یہ اللہ کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں۔'' یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر علماءِ اسلام کے کھلم کھلا احتجاج کے باوجود عالم اسلام نے ایک بڑی ذلت خیز تقدیر پرستی اختیار کر لی۔ (۷)

یہ ذلت خیز تقدیر پرستی دین اسلام کی روح یعنی خیر و شر اور جزا و سزا کے تصوّر کے بالکل منافی ہے۔ اس تقدیر پرستی کی رو سے جنت و دوزخ کا عقیدہ بھی بے معنیٰ ہو جاتا ہے کہ جب ہم اپنے ارادہ و اختیار سے نہ نیکی کر سکتے ہیں نہ برائی تو نہ انعام کے مستحق ٹھہرتے ہیں نہ سزا کے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عالی صفت عدل کے صریحاً خلاف ہے اور قرآن مجید کی تعلیمات کے بھی بالکل منافی۔ سورۃ الدہر میں ارشاد ہوتا ہے: انّا ھد ینٰہُ السبیل اِمّا شا کِراً وَّ اِمّا کفُوراo ترجمہ: ہم نے تمہیں راہ ہدایت بتا دی ہے اب چاہے شکر کرنے والے بنو یا نافرمان ہو جاؤ۔ (۸)

> مزید ارشاد خداوندی ہے: لیس لِلاْ نسان اِلاَّ مَا سَعیٰ o ترجمہ: انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ (۹)
>
> پھر ارشاد خداوندی ہے: مَنْ عَمِلَ صالحاً مِنْ ذَ کَرٍ اَوْ اُنثیٰ وَھُوَ مومنٌ فَلَنُحْیِینہ حیات طیبۃً o ترجمہ: جو بھی عمل صالح کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہو تو اسے ہم طیب زندگی عطا کرتے ہیں۔ (۱۰)

گویا طیب زندگی کی بنیاد عمل صالح ہے نہ کہ یہ پہلے سے متعیّن اور لاگو کردہ تقدیر ہے...... پھر تقدیر کیا ہے؟ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

> کسی شئے کی تقدیر قسمت کا وہ بے رحم ہاتھ نہیں جو ایک سخت گیر آقا کی طرح خارج سے کام کر رہا ہے بلکہ یہ ہر شئے کی حدِّ وسع ہے یعنی اس کے وہ امکانات جن کا حصول ممکن ہے اور جو اس کے اعماقِ وجود میں مضمر اور بغیر کسی خارجی دباؤ کے علی التواتر قوت سے فعل میں آ جاتے ہیں۔ (۱۱)

تقدیر، امکان اور حدِّ وسع کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ گندم کے دانے سے ہمیشہ گندم ہی اگے گی۔ یہ اس کی محکم تقدیر ہے۔ اس کی تقدیر میں ہی نہیں کہ اس سے آم اگیں جبکہ امکان اور حدِّ وسع یہ ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ زرخیز زمین، محنتی کسان اور کافی پانی، کھاد اور دیکھ بھال سے، ایک دانے سے اُگنے والے پودے میں سات بالیاں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں (قرآن پاک میں عمل خیر کی مثال اسی طرح دی گئی ہے) جبکہ کسی جگہ بنجر زمین، پانی کی کمی، کسان کی سستی اور ناکافی دیکھ بھال کے

باعث اسی ایک دانے سے اُگنے والے پودے میں محض ایک دو بالیاں ہوں جن میں تھوڑے تھوڑے دانے ہوں...... یا پھر یوں بھی ہوسکتا ہے کہ بنجر شورزدہ زمین اور پانی نہ ملنے سے وہ دانہ اگ ہی نہ سکے اور ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائے۔لیکن کتنا بھی موافق ماحول ہو پانی ہو، زرخیز زمین ہو گندم کے دانے سے جو یا چنا یا دیگر کوئی بھی شئے نہیں اُگ سکتی...... گویا تقدیر genes میں موجود امکانات ہیں...... کسی بھی شئے نے کہاں تک جانا ہے اور کیسا ہونا ہے اس کا امکان genes میں موجود ہے۔اس بات کو ماضی کے بجائے آج کا جدید سائنس کا طالبعلم زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے۔

قرآنی زبان میں اسی بات کو طینت کہا گیا۔'طینت' ہر شئے کی جبلّت میں مضمر امکانات ہیں وہ شئے جس بھی ماحول اور تناظر میں ہوگی انہی امکانات کے تحت نشو ونما یا ترقی (یا بربادی بھی!) حاصل کرے گی۔مثلاً ایک انگارہ بھڑک کر بجھے گا تو ایک چٹکی راکھ میں بدل جائے گا اور آتش فشاں پھٹے گا تو میلوں لاوے کی تہ جم جائے گی......اب سوال یہ ہے کہ انسانی تقدیر کیا ہے؟ قرآن مجید کی رو سے ابتدائے آفرینش ہی سے انسان کی تقدیر متعیّن کر دی گئی ہے: اِنّی جَاعِلٌ فی الارض خلیفہ o اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنایا اور خلافتِ الٰہیہ کے تمام تر امکانات اس میں مضمر رکھے سورۃ التین میں ارشاد باری ہے:

> لَقَدْ خَلَقْنَا الانسَانَ فِی اَحْسَنِ تقویم o ترجمہ: ہم نے انسان کو بہترین توازن (تناسب) کے ساتھ خلق کیا۔ (۱۲) پھر ساتھ ہی فرمایا: ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سافِلین o ترجمہ: پھر اسے بد سے بدتر حالت کی طرف پھیر دیا (۱۳)

پہلی آیت امکانات کو واضح کرتی ہے جبکہ دوسری آیت میں اِرادہ الٰہی کے خلاف انسانی اختیار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذلّت و پستی کا ذکر ہے۔ہم نے تو اسے احسن توازن دیا، یہ تقدیر ہے، اس کا اسفل ہونا یہ امکان ہے، اور امکان اس کے اپنے اختیار میں تھا جس کو استعمال کر کے وہ اسفل ہو گیا۔جبکہ وہ 'احسن' کی اعلیٰ ترین منازل بھی حاصل کر سکتا تھا......اور اس کا امکان بھی اس کی طینت میں موجود تھا......اعلیٰ ترین منازل حاصل کرنے کے لیے پروردگار عالم نے خود اپنی ذات اور پھر اطاعتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منشا و مقصود قرار دیا۔تخلقو با اخلاق اللہ اور صبغۃ اللہ کو اختیار کرنے کا قرآنی درس اس اعلیٰ معیار تک پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

خلافتِ الٰہی کے امکانات، فطرتِ انسانی میں صفاتِ الٰہی کے اختیار کرنے کی صلاحیت ہے تاہم اطاعت اور الٰہی صفات اختیار کرنے کی انتہا بھی ''عبدیت'' کی حدود میں ہے اور ''عبد'' مخلوق بھی ہے اور محدود بھی۔جبکہ اللہ خالق ہے اور لامحدود۔اسی لئے جب معراج نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہوا تو سبحان الذی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ......کہا گیا۔یعنی انسانیت کی معراجِ کمال، خلافتِ الٰہیہ کا مکمل ترین نمونہ بھی ''عبدیت'' ہی کا حاصل ہے۔''عبدیت'' کا جوہر معبود کی مکمل اطاعت اور غیر مشروط بندگی ہے۔ہر معاملے، ہر مرحلے ہر قدم پر اس کی رضا اور اس کے حکم کا خیال اور اپنے نفس اور اپنی مرضی کو مکمل طور پر اس کے حکم اور مرضی میں ڈھال دینا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِی نَفْسَہُ ابتغاء مرضات اللہ۔انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اپنے نفس کو رضائے رب کے لیے بیچ دیتا ہے۔......یعنی ہر اس بات کو پسند کرنا جو امرِ الٰہی ہے اور ہر اس بات سے اعراض کرنا جہاں نہی الٰہی ہے......اس مرحلے پر انسان کے لیے اللہ کا ایک بہت بڑا انعام ''دُعا'' ہے۔

دُعا، حدیثِ رسول کریم ﷺ کی رو سے مومن کا ہتھیار ہے۔یہ ہتھیار اسے ناگوار حوادث، ناخوشگوار حالات اور مشکلات و مصائب میں قوی بناتا ہے۔دُعا اسے جان لیوا احساسِ تنہائی، ناتوانی اور بے بسی کے کرب سے نجات دینے والی قوت ہے۔دُعا ایک ایسے ہمدم و غمگسار دوست ہونے کا احساس دلاتی ہے، جو ہمارے عیبوں اور خرابیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔نہ صرف ہر لمحہ ہماری رگِ جاں سے قریب تر ہے بلکہ رحمان و رحیم' قوی العزیز اور علیٰ کلِّ شئیٍ قدیر ہے۔نبی برحق ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے آخری الفاظ: اللّٰھُمَّ رفیق الاعلیٰ اے اللہ اے برتر رفیق۔اسی

احساس عبدیت کی انتہا سے ادا ہونے والے مبارک کلمات ہیں۔ اس رفیق اعلیٰ کی بارگاہ میں جب بندہ ناگوار تکلیف دہ اور مشکل امور کی آسانی کی درخواست کرتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ جسے میں پکار رہا ہوں۔

i-وہ سمیع وبصیر بھی ہے اور مجیب الدعواۃ بھی۔ii-وہ میرا خیر خواہ ہے۔iii-وہ صاحبِ قدرت ہے۔iv-اگر یہ ناگوار صورتِ حال قائم ہے تو اسی میں میرے لئے بہتری ہے ورنہ وہ میری اس حالت کو بدلنے کی قدرت رکھتا ہے۔

دُعا کا بنیادی عقیدہ قرآن پاک کی آیت: یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ عِندَہٗ اُمّ الکتاب o ترجمہ: وہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، جو چاہتا ہے ثبت کرتا ہے اللہ کے پاس (ہی) اُم الکتاب ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں: ''دُعا خواہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی، ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔''(۱۴)

ہم ربِّ کریم کو اس یقین کے ساتھ پکارتے ہیں کہ وہ مالکِ ''اُم الکتاب'' ہے۔ اور اُم الکتاب ایسی کتاب نہیں ہے کہ جو ایک دفعہ لکھ دی گئی ہے، جس میں ایک دفعہ جو لکھ دیا گیا وہ مٹایا نہیں جا سکتا بلکہ قدرت الٰہی اس کے لکھے کو 'شرائط مخصوصہ'' کے ساتھ مٹاتی بھی ہے اور نیا لکھتی بھی ہے۔ دُعا، صدقات، خیرات مسلسل محنت وجدوجہد مشکل کو آسانی اور ناکامی کو کامیابی میں بدلتے ہیں جبکہ ظلم، قطع رحمی، تکبر، کامیابی کو ناکامی میں بدلتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر بننے کے بعد جب شان وشوکت سے شاہی سواری پر گزر رہے تھے تو زلیخا جو ایک خستہ حال بڑھیا کی صورت سرِ راہگذر تھی' نے یہ شان و شوکت دیکھ کر کہا: ''پاک ہے وہ ربّ جو غلاموں کو ان کی اطاعت کے سبب شاہی دیتا ہے اور شاہوں کو ان کے تکبّر کی وجہ سے ذلیل کرتا ہے۔'' لیلۃ القدر میں مانگی جانے والی مسنون دُعاؤں میں ایک دُعا یہ بھی ہے کہ میرے ربّ آج کی رات، نامہ اعمال میں اگر میرا نام اشقیاء میں ہے تو اسے مٹا کے سعداء میں لکھ دے.....اگر تقدیر محض جبری احکام کے ایک سلسلے کا نام ہو تو 'دُعا' کا تصوّر بے معنی ہو جاتا ہے۔

مختصراً عمل خیر، جہد مسلسل اور دُعا وصدقات ایسے حقائق ہیں جو تقدیر کے جبری تصور کی نفی کرتے ہیں۔ جبکہ موت و حیات اور سلسلہ روز وشب انسان کے ''مختار کل'' ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ انسانی زندگی بین الجبر والاختیار ہے جیسا کہ باب العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے انسان کے مجبور ومختار ہونے کا سوال کیا تو آپ نے سوال کرنے والے کو حکم دیا اپنا ایک پاؤں اٹھاؤ اِس نے تعمیل کی تو آپ نے دوسرا پاؤں اٹھانے کو بھی کہا۔ ظاہر ہے اس نے معذوری کا اظہار کیا، آپ نے فرمایا تم اتنے ہی مجبور ہو اور اتنا ہی اختیار رکھتے ہو کہ ایک پاؤں تو اٹھاؤ مگر دونوں نہ اٹھا سکو۔

تقدیر کا درست تصور انسان کی انفرادی اور اقوام وملل کی اجتماعی زندگی کی تہذیب وتطہیر کرتا ہے اس کی عبادات کو درست سمت دیتا ہے اور عمل ودنیاوی زندگی میں اس کے لئے ایک زبردست متحرک اور فعال قوت ہے۔ آقا ومولا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک فرمان سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے جس میں آپ نے نصیحت فرمائی ہے کہ جب تم امور دنیا کی طرف راغب ہو تو سمجھو کہ یہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جب عبادت کی طرف آؤ تو سمجھو بس یہ آخری عبادت ہے اس سے کار دنیا میں بھی اور عبادات میں بھی توانائی، خلوص اور استحکام آتا ہے اور ظاہر ہے جو بھی کام اس یقین کے ساتھ کیا جائے اس میں کامیابی یقینی ہے۔ اور یہ کامیابی ہی انسان کی اپنی بنائی ہوئی تقدیر ہے:

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

اپنے قلم سے لکھی ہوئی تقدیر اور اپنے زورِ بازو اور خونِ جگر سے حاصل کی ہوئی جنت اولادِ آدم کی وہ منزل ہے جس سے اسے پھر نکالا نہیں جا سکتا۔ اسی لئے ایک غیور انسان کی نگاہ میں:

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے تیرے خونِ جگر میں
تعمیرِ خودی کر اثر آہ رسا دیکھ

حوالہ جات

۱۔ اقبال، علامہ محمد، ''خودی، جبر وقدر حیات بعد الموت'' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، سید نذیر نیازی، اظہر سنز پرنٹرز لاہور، طبع چہارم، نومبر ۱۹۹۴، صفحہ ۱۸۰

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۲

۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۶

۴۔ القرآن، سورۃ بقرہ: آیت ۱۳۸

۵۔ اقبال علامہ محمد، خودی جبر وقدر حیات بعد الموت، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، مرتبہ: سید نذیر نیازی، صفحہ ۱۷۸

۶۔ القرآن، سورۃ النجم، آیت ۱۷

۷۔ اقبال، علامہ محمد، ''خودی، جبر وقدر حیات بعد الموت'' صفحہ ۱۶۸

۸۔ القرآن، سورۃ دہر، آیت ۳

۹۔ القرآن، سورۃ النجم، آیت ۳۹

۱۰۔ القرآن، سورۃ نمل، آیت ۹۷

۱۱۔ اقبال، علامہ محمد، ''مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار'' تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ، سید نذیر نیازی، ص ۷۷

۱۲۔ القرآن، سورہ التین، آیت ۴

۱۳۔ ایضاً، آیت ۵

۱۴۔ اقبال، علامہ محمد، ''ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا'' تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ، سید نذیر نیازی، ص ۱۳۹